اسلام کا نظامِ تعلیم

محمد یوسف گورایہ

ایمان و علم کا رشتہ ادیانِ عالم میں صرف اسلام ہی وہ دین ہے جس نے علم کو ایمان کے لئے ضروری قرار دیا ہے، سب سے پہلی وحی میں ارشاد ربانی ہے: "اقرأ باسم ربك الذی خلق" اور "اقرأ و ربك الاكرم الذی علم بالقلم" پڑھئے اپنے اس رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، اور پڑھئے بحالیکہ آپ کا رب کریم وہ ہے جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ علم عطا کیا۔ علم کی اہمیت کے پیشِ نظر اللہ نے خاص طور پر اس بات کا ذکر فرمایا کہ اسے خود اللہ ہی نے انسان کو سکھایا ہے: "علم الانسان مالم یعلم" پھر یہ بھی کہ انسان پر یہ اللہ ہی کا احسان ہے کہ اس نے یہ سکھایا کہ وہ علوم و فنون کی حفاظت اور ابلاغ عام کے لئے انھیں تحریر میں لائے۔ قرآن کی اس سب سے پہلی وحی میں علم کے حصول اور پڑھنے کی تاکید دونوں کا بیان نہایت معنی خیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفاتِ ربوبیت اور خالقیت کے ذکر سے پہلے انسان کی تعلیم کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ تعلیم اور حصولِ تعلیم کی اہمیت بڑی حد تک واضح ہو جاتی ہے۔

ایمان کے لئے علم کی ضرورت کا قرآنی تصور، تاریخِ عالم میں ایک زبردست انقلاب تھا۔ پورا قرآن الحمد سے والناس تک علم، ایمان اور ان کے مطابق عمل کرنے اور دونوں جہان میں فلاح و کامیابی حاصل کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ ایک مسلمان کے لئے جس طرح عبادات کی تفصیلات جاننا ضروری ہے۔ اسی طرح معاملات کی جزئیات سے واقفیت نہایت اہم ہے۔ اسلامی عبادات کا تصور بذاتِ خود ایک انقلابی تصور ہے۔ ہر عبادت کسی نہ کسی طرح انسانی و معاشرتی تعلقات کی آئینہ دار ہے۔ لیکن معاملات کا دائرہ تو اتنا وسیع ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ، اسلام کی اصولی تعلیمات سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ عبادات و معاملات کی اس گہری ہم آہنگی کے تقاضے کو پورا کرنے کے لئے ہر مسلمان پر فرض عائد ہوا کہ وہ ایمان، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی تفصیلات جاننے کے ساتھ حلال و حرام، نکاح و طلاق، صلح و جنگ، اطاعت و عصیان، معاشرتی و عائلی قوانین کے بارے میں تعلیم حاصل کرے، باصلاحیت اور باشعور

افراد پر مبنی معاشرے کی تشکیل کے ساتھ قرآن نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ اسلام روئے عالم کے ادیان پر غالب آئے گا اس کیلئے ضروری تھا کہ معاشرت، معیشت، سیاست، تہذیب اور تمدن کے اعلیٰ اصولوں کی تعلیم کے ساتھ ان علوم کی طرف رہنمائی بھی کرتا جو طبیعیات سے متعلق تھے یہی وجہ ہے کہ انفس و آفاق پر غور و تدبر کا حکم دیا۔ ارض و سموات اور ان کے درمیان کی موجودات کو سمجھنے، نباتات و جمادات پر غور کر کے نتائج اخذ کرنے اور اجرام فلکی پر غور و فکر کر کے انہیں مسخر کرنے کی تاکید کی۔ علوم کے اس تنوع میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے جب ایک طرف سابق انبیاء جن کی تعلیمات کا ماخذ حکم خداوندی تھا اور دوسری طرف حکماء جن کی تعلیمات کی بنیاد علت و معلول کی تحقیق اور عقلی دقیقہ سنجی تھی۔ نبی آخر الزمان کی تعلیمات درحقیقت قرآن حکیم کی تعلیمات کی تشریح و توضیح ہیں جن کے امتزاج کو ایک انتہائی بلیغ اصطلاح کتاب و حکمت سے بیان کیا گیا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ اگر قرآنی حکمت نے انسان کے ایک ایک اندرونی جذبہ، باطنی قوت اور اخلاقی فطرت کا سراغ لگایا تو کتاب نے حکمت کو محض سخن طرازی اور نکتہ پروری پر ہی ختم نہیں ہونے دیا بلکہ پیغمبر اسلام کے مثالی کردار اور مقدس کارناموں کے ذریعے خیر و برکت کی سلسبیل کا فیضان بھی جاری کر دیا۔

اب ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ قرآنی نقطۂ نظر سے اہلِ علم کے ایمان کا بڑا درجہ ہے۔ ناسمجھ اور اپنی ضد پر اصرار کرنے والے کے ایمان کو قرآن ناپختہ اور ضعیف قرار دیتا ہے۔

قرآن پاک نے ایمان کے ساتھ عمل پر بڑا زور دیا ہے، چنانچہ صرف دلی عقیدے کا اعتبار اسلام میں نہیں۔ ایمان و عقیدے کے مطابق عمل کا اظہار ضروری ہے اور ایمان کے مطابق عملی مظاہرہ کو قرآن نے اسلام سے تعبیر کیا ہے (قالت الاعراب امنا قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم (۴۹:۱۴)۔

جہالت، ضد اور گنوارپن کی قرآن نے شدید ترین الفاظ میں مذمت کی ہے، اور بتایا ہے کہ ناسمجھ گنوار اپنے عقیدے میں بہت سخت ہوتے ہیں۔ اس کا سبب یہ بتایا کہ احکام الٰہی کے اسرار و رموز کو ایک ناسمجھ اجڈ اپنی ضد کی وجہ سے نہیں سمجھ سکتا۔ "الاعراب اشدّ کفراً ونفاقاً واجدرُ الاّ یعلموا حدود ما انزل اللہ علیٰ رسولہ (۹:۹۷)

ایمان کے لئے علم کو ضروری قرار دینے کے سلسلے میں سورۃ عنکبوت بڑی شہادت فراہم کرتی ہے، اس کی سب سے پہلی آیت میں اس بات کی نفی کی گئی ہے کہ محض زبان سے ایمان کا اقرار کر لینے سے انسان چھوڑ دیئے جائیں گے۔ پھر اس سورۃ کی بیالیس آیتیں عقائد و اخلاق، اعمال و افعال، اقوام و ملل کے عروج و زوال پر تبصرہ کرتی ہیں اور سابق انبیاء کے واقعات و حالات بیان کر کے فرمایا کہ: یہ تاریخی حقائق پر مبنی مثالیں ہیں،

ہم انہیں لوگوں کے سمجھانے بجھانے کے لئے بیان کرتے ہیں اور ان مثالوں کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ جو عالِم ہوں۔ اس سورۃ نے انتہائی وضاحت کے ساتھ اس بات کا ثبوت فراہم کیا، کہ علم وعمل کے بغیر ایمان کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور ایمان اسی شخص کو فائدہ پہنچا سکتا ہے، جو علم کی روشنی سے مستفیذ ہو " وما یعقلھا الا العالمون " اسی سورۃ کی آیت نمبر ۴۹۔ اس مضمون کی یوں وضاحت کرتی ہے: اہلِ علم لوگوں کے لئے یہ کتاب (قرآن) تو انتہائی بیّن دلائل ہیں اور ہمارے ان واضح دلائل کا انکار سوائے ظالم (جاہل) لوگوں کے اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ اس آیت میں اہل علم، اور ظالم وجاہل کو ایک ساتھ بیان کر کے اس بات کی وضاحت فرمائی، کہ قرآن پر انہیں لوگوں کا ایمان صِدق پر مبنی قرار دیا جائے گا۔ جنہوں نے اپنے ایمان کو علم سے مضبوط کیا ہو، جاہل اور ظالم زبانی اقرار کے باوجود، قرآن کے بیّن دلائل سے کوئی رہنمائی حاصل نہیں کرسکیں گے، بلکہ الٹا ان واضح دلائل کا انکار کردیں گے۔ سورہ فاطر نمبر ۳۵ کی دس آیات ۱۹ تا ۲۸ علم و ایمان کے لزوم کو قطعی دلائل سے بیان کرتی ہیں اور جہالت کو ایمان کی ضد قرار دیتی ہیں، ان آیات میں جہل اور علم کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"اندھا اور بینا برابر نہیں ہو سکتے اور نہ تاریکی اور نہ روشنی اور نہ چھاؤں اور نہ دھوپ،
اور نہ ہی زندہ اور مردہ برابر ہو سکتے ہیں"

پھر ارض وسماء جبال وثمرات اور انکے الوان واقسام کا تذکرہ کرکے، انسانوں۔ جانوروں اور چوپایوں اور ان کے انواع واقسام کا ذکر کیا ہے اور آخر میں فرمایا: خدا سے اس کے صرف وہی بندے ڈرتے ہیں جو اہل علم ہوں، اس آیت میں ایک طرف ارض وسماء کی ہر قسم کی مخلوق کا بیان ہے۔ دوسری طرف اس مخلوق میں سے اہلِ علم انسانوں کا تذکرہ ہے اور تیسری طرف خشیت الٰہی کا اظہار ہے۔ قرآن میں خشیتِ الٰہی، اللہ پر ایمان کا بنیادی عنصر ہے اور اس آیت کی رُو سے ارض وسما کی تمام مخلوقات میں سے اللہ کی خشیت صرف ان انسانوں کو نصیب ہوگی جو علم وفضل کی دولت سے مالامال ہوں گے اور جو لوگ علم سے کورے ہونگے ان کا شمار شکل وصورت کے اعتبار سے خواہ انسانوں میں ہو یا حیوانوں میں، جمادات میں ہو یا نباتات میں خشیت الٰہی سے محروم رہیں گے۔ اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا (۳۵: ۲۸) سورۃ زمر نمبر ۳۹، میں مختلف مضامین بیان کرکے پوچھا: "قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون (۳۹: ۹)" کہئیے کیا علم والے اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں؟" گویا ایمان وعقائد کا معاملہ ہو یا معاشرت ومعیشت کا

ہر اعتبار سے انہیں لوگوں کو اہمیت حاصل ہوگی جو اہل علم ہوں گے اور جہلا کا نہ ایمان معتبر ہوگا، نہ ہی کسی دوسرے کام میں انہیں کوئی اہمیت دی جائے گی۔ ایمان و علم کا لزوم چونکہ اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ ہے، اس لئے جہاں علم کو ایمان کا جزوِ لاینفک قرار دیا وہاں جہل کو ایمان کی ضد ٹھہرایا۔ اور پھر اس عقیدے کی تکرار و وضاحت کی۔ چنانچہ فرمایا: یرفع اللّٰہ الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات (۵۸ : ۱۱) اللہ ان لوگوں کے درجات کو بلند کرے گا جو تم میں سے ایمان لائے اور جنہیں علم دیا گیا، اس آیت میں ایمان علم کو ایک ساتھ بیان کر کے ان کے لزوم کو فرض عین قرار دیا ہے اور اس ایمان کو درجات کی بلندی کا سبب بتایا ہے۔ جو علم سے مضبوط کیا گیا ہو، اسلامی نقطہ نگاہ سے اہل علم کے ا ایمان کا بڑا مرتبہ ہے یہی وجہ ہے کہ ایک آیت میں ایسے اہلِ علم ایمانداروں کا مرتبہ اتنا بلند بتایا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کے اثبات پر شہادت دی تو اس شہادت میں پوری کائنات میں سے جو تین گواہ پیش ہوئے ان میں سے ایک خود اللہ، دوسرے فرشتے اور تیسرے اہلِ علم تھے: شھد اللّٰہ انہ لا الٰہ الا ھو والملئکۃ واولوا العلم (۳ : ۱۸)۔ ایمان و علم کے التزام کا یہ اہتمام اور پھر اس التزام کی یہ قدردانی تاریخ ادیان عالم میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس آیت میں ترتیبِ بیان کے اعتبار سے فرشتوں کا بیان اگرچہ اہلِ علم سے پہلے کیا گیا ہے لیکن ایک دوسری جگہ اس بات کی وضاحت کردی ہے کہ انسان جب ایمان و علم کے زیور سے آراستہ ہوتا ہے۔ تو اس کا درجہ فرشتوں سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس کا ثبوت حضرت آدمؑ کے قصے میں بالوضاحت موجود ہے۔ حضرت آدمؑ کا ایمان جب علم سے مزیّن ہوگیا "وعلّم آدم الاسماء کلّھا" (۲ : ۳۱) تو فرشتے جو محض ایمان رکھتے تھے، ایمان و علم کے پیکر کے آگے سجدہ ریز ہوگئے اور علانیہ اقرار کرلیا: "سبحٰنک لا علم لنا" اے اللہ تو پاک ہے ہمیں قطعاً علم نہیں ہے۔

اسلام میں ایمان و علم کے لزوم کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے، کہ اس نے سابق انبیاء کی تعلیمات کی تصدیق اور ان میں تلبیس حق و باطل کی تحقیق کی ذمہ داری بھی اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ "نزّل علیک الکتٰب بالحق مصدِّقاً لما بین یدیہ" (۳ : ۲) اور اس اتنی بڑی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا، کسی مسلمان کے لئے ممکن نہیں جب تک وہ تمام علوم و فنون سے پوری طرح واقف نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے نبی آخرالزماں کو وہ دین دیکر بھیجا جسے ادیانِ عالم پر غالب آنا ہے۔ "ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلّہ (۶۱ : ۹) ظاہر ہے کہ دین اسلام کے بقیہ ادیان پر غالب آنے کا یہی مطلب ہے کہ اس دین کے ماننے والے، ان تمام علوم سے پوری طرح آگاہ ہوں جو تقابل ادیان کے لئے ضروری ہیں، احقاق حق، اور

قوتِ استدلال سے پوری طرح مسلح ہوں۔ ہر دور کے علوم و فنون اور منطق و فلسفہ سے پوری طرح آراستہ ہوں، اور ان ادیان کے ماننے والوں نے جن جن علوم میں اپنی بالادستی قائم کر رکھی ہو ان پر نہ صرف پورا پورا عبور ہو، بلکہ دین اسلام کو ان پر غالب کرنے کے لئے ضروری ہے، کہ مسلمان ان کی قیادت کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ دینِ اسلام کا یہ غلبہ صرف اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے کہ مسلمان انفرادی و اجتماعی حیثیت سے دین و دنیا کے علوم کے قائد ہوں۔ اسلام کا یہ بھی دعویٰ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانیت کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں ”قل یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا“ اس دعوے کی صداقت کا تقاضا یہ ہے کہ تمام مسلمان پوری انسانیت کی رہنمائی کی قیادت کی اہلیت رکھتے ہوں۔ اور عالم انسانیت کی رہنمائی کی صلاحیت اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی، جب تک کہ ہر قسم کے علوم کے حصول کے بعد مسلمان پوری انسانیت کے قائد نہ بن جائیں۔ ایک آیت میں فرمایا کہ مسلمانوں کو عالم انسانیت میں وہ کردار ادا کرنا ہوتا ہے جو رسول مسلمانوں میں ادا کرتا ہے۔ ”لتکونوا شھداء علی الناس و یکون الرسول علیکم شھیدا“ (۲: ۱۴۳) ایک اور آیت میں فرمایا کہ تم ”خیر امۃ“ ہو، تمہارا فرض منصبی یہ ہے کہ تم بہتر سے بہتر حالت کی طرف مسلسل رہنمائی کرتے رہو، انسانی فلاح و بہبود کے اصولوں کو اپنا کر معاشرتی۔ اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے اس حیثیت میں ہو کہ تم پوری انسانیت کو بھلائی کا حکم دے سکو اور ان مضر کاموں سے انسانیت کو روک سکو جن میں اس کی ہلاکت ہو، ”کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر“ اب یہ بات اتنی بیّن اور واضح ہے کہ ”شُھَدَاءَ عَلَی النَّاس“ اور ”خیر امۃ“ جیسے عظیم رتبوں پر فائز ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مسلمان انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے، پوری انسانیت میں ایمان و علم کے اس مقام پر فائز نہ ہوں، جس مقام پر اصحابِ رسولؐ مسلمانوں میں فائز تھے۔ جب تک مسلمان عالم انسانیت میں اپنے اس مقام کو حاصل نہیں کر لیتے، قرآنی تعلیمات کی رو سے ان کا ایمان غیر معتبر ہے اور صاف ظاہر ہے کہ ایمان کے بعد مسلمان کو اس مقام پر اگر کوئی طاقت پہنچا سکتی ہے تو وہ صرف علم میں زبردست ترقی اور ان پر اس حد تک دسترس ہے کہ وہ اقوامِ عالم کی قیادت خود سنبھال سکیں۔

تعلیمی اقدامات

اس بات کے ثابت ہو جانے کے بعد کہ اسلام میں ایمان کی تکمیل کی لازمی شرط علم ہے اور یہ کہ علم کے بغیر ایمان غیر معتبر ہے، اب ہم مختصر طور پر اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ ایمان و علم کو لازم و ملزوم قرار دینے والے رسولؐ نے علم کی ترویج کے لئے عملاً

کیا کیا اقدامات اٹھائے: "بلغ ما انزل الیک" کی ہدایت کے تحت آپ نے جہاں تبلیغ کا فریضہ انجام دیا، وہاں تعلیم و تربیت کا بھی اہتمام فرمایا۔ قرآن نے رسولؐ اکرم کے تعلیم دینے پر شہادت دی ہے "یتلوا علیھم ایتہٖ ویزکیھم ویعلمھم الکتب والحکمۃ" (جمعہ:۱) اس آیت میں تین فرائض کی نشان دہی کی گئی ہے:۔ ۱۔ بیّن دلائل کو تلاوت کے ذریعہ پیش کرنا۔ ۲۔ مسلمانوں کو تربیت دینا۔ ۳۔ اور کتاب و حکمۃ کی تعلیم دینا۔ ابن ماجہ باب فضل العلماء کی روایت کے مطابق آپؐ نے فرمایا "بُعِثتُ مُعلِماً" مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے، تاریخ شاہد ہے کہ آپؐ نے اس فریضہ کو باحسن طریق انجام دیا۔

دارِ ارقم
سب سے پہلی اسلامی تعلیم گاہ

مکی دور میں ویسے تو جس وقت اور جس جگہ بھی آپ کو موقع ملتا آپ تبلیغ فرماتے لیکن باقاعدہ تعلیم کی نشر و اشاعت کے لئے سب سے پہلی جس درسگاہ کا پتہ چلتا ہے وہ "دارِ ارقم" تھا۔ جو لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے، وہ اس سب سے پہلی یونیورسٹی کے باقاعدہ طالب علم شمار ہوتے، ایک خاص پروگرام کے تحت آپؐ اپنے صحابہ کی تربیت کرتے اور باقاعدہ درس و تدریس کا اہتمام فرماتے۔ قرآن کی تعلیمات کی تبلیغ اور تعلیم کے فرائض خود حضورؐ کے ذمے تھے لیکن آیاتِ قرآنی کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے آپ نے ایک الگ شعبۂ کتابت قائم کر رکھا تھا۔ بخاری کتاب العلم کی روایت کے مطابق اس پر سب سے پہلے عبداللہ بن سعید بن عاص مقرر ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن سعید شعبہ کتابت کے نگراں ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کو کتابت بھی سکھاتے تھے۔ جب مدینے کے چند لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ تو آپ نے قرآنی تعلیمات کی تبلیغ و تعلیم کا ایک مرکز وہاں قائم کیا اور حضرت مصعب بن عمیر کو بحیثیت انچارج وہاں مقرر کیا۔

مملکت اسلامیہ کی سب سے بڑی دانشگاہ "مسجد نبوی"

ہجرتِ مدینہ کے بعد آپ نے وہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے دنیا کی عظیم الشان یونیورسٹی کی بنیاد رکھی جو مسجد نبوی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس درسگاہ اعظم میں انسانی ترقی کی ہر قوت و صلاحیت نشو و نما پا رہی تھی، سرورِ کائنات کی ذات اس عمومی جامعہ کی مرکز و محور تھی، ہر قسم اور ہر مذاق کے طالب علم آتے تھے۔ اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی استعداد کے مطابق تحصیل علم کرتے تھے۔ اس یونیورسٹی میں صحابہ اپنے مذاق اور طبیعت کے مطابق مختلف علوم میں دلچسپی کے اعتبار سے مختلف شعبوں میں بٹ گئے تھے۔ سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی جلد ششم میں اس درس گاہ کا نقشہ یوں کھینچا ہے: "کہیں ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ جیسے فرمانروا زیرِ تعلیم ہیں، کہیں طلحہؓ و زبیرؓ و معاویہؓ و سعدؓ بن معاذ و سعدؓ بن جبیر جیسے اربابِ رائے و تدبیر ہیں، کہیں خالدؓ، ابوعبیدہؓ، سعدؓ

بن ابی وقاص، اور عمرو بن العاص جیسے سپہ سالار ہیں، کہیں وہ ہیں، جو بعد کو صوبوں کے حکمران، عدالتوں کے قاضی، اور قانون کے مقنن بنے، کہیں ان زہاد و عبّاد کا مجمع ہے، جن کے دن روزوں میں اور راتیں نمازوں میں کٹتی ہیں، کہیں ابوذرؓ و سلمانؓ و ابو درداءؓ جیسے وہ خرقہ پوش ہیں، جو "مسیح اسلام" کہلاتے تھے، کہیں وہ صفّہ والے طالب العلم تھے جو جنگل سے لکڑی لاکر بیچتے اور گزارہ کرتے، اور دن رات علم کی طلب میں مصروف رہتے تھے، کہیں حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابت جیسے فقیہ و محدث تھے جن کا کام علم کی خدمت اور اشاعت تھا"

اقامتی تربیت گاہ

اس درس گاہ کے مختلف شعبوں میں ایک شعبہ ایسا بھی تھا، جس میں اساتذہ کو تربیت دی جاتی تھی۔ یہ رہائشی شعبہ تھا، جس میں تربیت حاصل کرنے والے تمام طالب علم شب و روز وہیں قیام کرتے تھے۔ یہ ایک چبوترہ تھا، جو مسجد نبوی کے ساتھ ہی ملحق تھا۔ اسے "صفّہ" کہا جاتا تھا اور جو لوگ اس میں تربیت پاتے تھے انہیں "اصحاب الصفّہ" کا نام دیا جاتا تھا۔ آپ یہاں اصحاب الصفہ کو بنفس نفیس قرآن کی تعلیم دیتے، بخاری کی روایت کے مطابق آپؐ نے اپنے ساتھ چار معلم اور ایک خوشنویس مقرر فرمایا تھا، آپ فرماتے تھے "چار آدمیوں سے قرآن پڑھو، عبداللہؓ بن مسعود، سالمؓ مولیٰ حذیفہ، ابیؓ ابن کعب اور معاذؓ بن جبل"

تعلیم نسواں

خواتین کی تعلیم و تربیت کو بھی آپؐ نے اتنی ہی اہمیت دی جتنی مردوں کو دی تھی، آپؐ کے پبلک خطبوں اور جلسوں میں مسلمان خواتین شریک ہوتیں، غزوات و حج کے مواقع پر وہ آپؐ سے استفادہ کرتیں، لیکن یہ سب خواتین کے مخصوص حالات کے پیش نظر کافی نہ تھا۔ چنانچہ آپ نے اس کے لئے خاص اہتمام فرمایا اور خواتین کی تعلیم و تربیت کے لئے ام المومنین حضرت عائشہؓ کی سرکردگی میں تعلیم نسواں کا الگ پروگرام بنایا۔ تعلیم نسواں کا مرکز خود حضرت عائشہؓ کا اپنا گھر تھا۔ اور باقی امہات المومنین کے حجرے اور دوسری پڑھی لکھی مسلمان خواتین کے گھر اس کے ملحقہ ڈیپارٹمنٹ تھے۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے حضورؐ کی رہنمائی میں تعلیم نسواں کے پروگرام کو انتہائی کامیابی کے ساتھ چلایا، مدینے کی خواتین اور باہر سے آنے والی خواتین کی تعلیم و تربیت کے فریضے کو آپ نے بڑی ہی حسن و خوبی سے نبایا۔

سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایمان کے ساتھ علم سکھانے کی ضرورت کا اتنا احساس تھا کہ آپ صحابہ کرام کی تعلیم و تربیت کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ غزوہ بدر کے قیدیوں میں جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، ان کو رہا کرنے کا فدیہ آپؐ نے یہ مقرر فرمایا کہ ہر قیدی دس مسلمان بچوں کو

لکھنا پڑھنا سکھا دے

صوبوں میں معلمین کا تقرر

حضورؐ کی ان کوششوں کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرامؓ قلیل عرصہ میں علم وفضل کی دولت سے مالا مال ہو گئے اور آپؐ کو تربیت یافتہ ماہرین فن اساتذہ کو مختلف مقامات پر بھیجنے میں کبھی کمی محسوس نہ ہوئی۔ یمن میں حضرت معاذ بن جبل کی تقرری ہوئی۔ نجران میں عمروؓ بن حزم کو معلم بنا کر بھیجا گیا۔ اسی طرح جب قبائل قارہ وعضل مشرف بہ اسلام ہوئے تو آپؐ نے ان کی تعلیم کے لئے چھ مدرس مقرر کئے: مرشدؓ بن ابی مرشد، عامرؓ بن ثابت، خبیبؓ بن عدی، خالدؓ بن البکیر، زیدؓ بن وثنہ، عبداللہؓ بن طارق۔ قرآن کے ایمان وعلم کے لزوم پر اصرار کا یہ اثر ہوا کہ جو قبیلہ بھی اسلام قبول کرتا فوراً علم سیکھنے کے لئے مدینہ آتا یا چند نمائندہ افراد کو مدینے بھیجا جاتا تاکہ وہ وہاں سے علم سیکھ کر اپنے قبیلے کو تعلیم دیں۔ سیر واحادیث کی کتابیں ایسے بے شمار واقعات سے بھری پڑی ہیں۔

جہالت کی روک تھام اسلامی حکومت کا فریضہ ہے

مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر اسلام ہی وہ واحد دین ہے جس نے علم کو یہ بلند مرتبہ دے کر اسے ایمان کا جزو لاینفک قرار دے دیا۔ اور پھر اس "کتاب وحکمت" کو عملاً نافذ کرنے کے لئے ان تمام وسائل سے کام لیا گیا، جو انسانی حد تک ممکن تھے۔ یہ اس لئے ضروری قرار دیا گیا کہ کہیں دین اسلام کا بھی سابقہ ادیان کی طرح زبانی اقرار اور چند عادات کی ادائیگی تک محدود نہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کے فروغ وترقی اور اس کی نشر واشاعت کو مصارف زکوٰۃ میں داخل کیا گیا، اور حکومت پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی کہ وہ جہالت کے مکمل خاتمہ تک اس فریضے کی ادائیگی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ اگر دنیا میں کوئی اسلامی حکومت قائم ہو، اور اس ملک میں جہالت باقی رہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا، کہ ایسی حکومت جان بوجھ کر مسلمانوں کو کافر بنانے پر تلی ہوئی ہے اور قصداً اس بات کا تہیہ کئے ہوئے ہے کہ مسلمان ایمان کی تکمیل سے قاصر رہیں۔ اور اس طرح عملاً اسلام کے منکر بنیں۔ ایسی حکومت قرآن کے نقطہ نظر سے اسلامی حکومت نہیں کہلا سکتی، کیونکہ اسلامی حکومت کا تو فرض اولین یہ ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی بھلائی اور ان کی ترقی وعروج کے لئے اپنے تمام وسائل بروئے کار لائے، تاکہ مسلمان ایمان کے ساتھ علم کی دوسری شرط پوری کر کے صحیح اور سچے مسلمان بن سکیں۔

زکوٰۃ کا ایک مصرف تعلیم وتربیت بھی ہے

مصارفِ زکوٰۃ میں سے ایک مصرف تعلیم قرآن، دین میں تفقہ پیدا کرنا اور قارئین کو بھیجنا تھا، حضرات معاذؓ بن جبل، ابوموسیٰؓ الاشعری، عمروؓ بن حزم وغیرہم کو جب یمن، نجران اور دوسرے اضلاع میں تعلیم دین پر متعین کیا گیا تو یہ حضرات اپنے اپنے علاقو میں تعلیمی اخراجات زکوٰۃ ہی سے پورے کرتے تھے، ابن جوزی نے سیرۃ العمرین میں بیان کیا ہے، کہ حضرت

عمرؓ نے معلمین کے لئے باقاعدہ ماہوار تنخواہ مقرر کر رکھی تھی۔ مصارفِ زکوٰۃ میں "فی سبیل اللہ" ایک ایسا مصرف ہے، جو تعلیم جیسے اہم فریضے کی ادائیگی پر خرچ کیا جاتا تھا، ایک طرف علم کو ایمان کے ساتھ لازم قرار دیا اور دوسری طرف علم کی نشر و اشاعت کرنے کے لئے اسے حکومت کے بنیادی فرائض میں رکھکر اس کی عظمت و اہمیت کو انتہا تک پہنچادیا۔ وجہ یہ ہے کہ علم اور ادراک ہی دو شاندار خوبیاں ہیں، جن کی بنا پر ایک سائنسدان و حکیم کو حشرات الارض پر ترجیح دی جاتی ہے۔ انسان کی برتری کا مدار اس کے ذہنی شعور پر ہے۔ علم، جذبات اور قوت کے حلقہ کو تا بہ حد امکان وسعت دینا، انسانی شخصیت کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ قوتِ ارادی اور قوت کے بروئے کار لانے ہی سے فرد جماعت کا مؤثر رکن بن سکتا ہے۔ پھر یہ بھی کہ صرف ایک غیر معمولی عظمت کے مالک انسان ہی سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ انفرادی فکر سے کوئی ایسا نصب العین وضع کرے، جس کے ساتھ تعاون کرنے میں لوگوں کو بہتری نظر آئے، اور جب ایسا نصب العین تیار ہو جائے تو وہ دوسروں کو پیروی پر آمادہ بھی کر سکے، علم و ادراک کے بغیر ایک شخص برسر اقتدار طاقت سے خواہ وہ شخصی ہو یا جمہوری آمادۂ مصلحت رہتا ہے "یہ صفت عظیم المرتبت انسانوں کے امتیازی اوصاف کی ضد ہے۔ اسلام ایسے افراد چاہتا ہے جن میں اتنی پروازِ فکر ہو کہ وہ موجودہ نظام سے بہتر اور مختلف نظام کا تصور قائم کر سکیں، حال کو اقدار کے نقطہ نظر سے جانچ سکیں، اس لئے کہ تقلید پسندی کی تمام صورتیں فہم و فراست کی موت کے مترادف ہیں۔ اسلام کا مقصد اجتماعی انا کے لئے انفرادیت کا عروج و ارتقا ہے۔ اور اس عروج و ارتقا کو درجہ کمال پر پہنچانے کے لئے علم نفسیات، علم فطرت، علم ابدان، علم حیوانات، سائنسی انکشافات، جدید نفسیاتی تجربات اور مشاہدات کا گہرا مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔ اور سہولت کا بندوبست کرنا حکومت کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔ "فریضۃ من اللہ"

مقصد تعلیم

تعلیم کا مقصد اولین یہ ہے کہ وہ انسان کی تمام خداداد صلاحیتوں کی تربیت کرے۔ ظاہری جوارح و اعضاء سے لے کر اندرونی اعضائے رئیسہ کی تربیت اور ان کے نشوو ارتقاء کا فریضہ تعلیم کے ذمے ہوتا ہے اس لئے یہ بات حکومتِ اسلامیہ کے فرائض منصبی میں داخل ہے (فریضۃ من اللہ) کہ وہ ملک کے ہر فرد کی ظاہری و باطنی صلاحیتوں کی تربیت کا بہتر سے بہتر اہتمام کرے اور ہر فرد کو اس قابل بنائے کہ اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر ملک و ملت کی خدمات انجام دے، جو حکومت اپنی مملکت کے افراد کی صلاحیتوں کی تربیت نہیں کرتی، وہ دراصل پوری قوم کو اپاہج بنانے کے جرم کا ارتکاب کرتی ہے۔

تعلیم و دفاع

مسلمانوں کو کفر کے مقابلے میں ہر طرح سے تیار رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (۸ : ۶۰) اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے پوری قوت کے ساتھ تیاری کرو۔ افرادی قوت کو بڑھا کر اور اسلحہ سازی کی فیکٹریاں قائم کر کے، افرادی قوت اور اسلحہ سازی کی زبردست تیاری سے اللہ کے دشمنوں اور خود اپنے ان دشمنوں کو ڈراؤ (جن کے ساتھ تمہارا براہ راست تصادم ہے) اور ان کے علاوہ ان دشمنوں کو بھی جنہیں اگرچہ تم نہیں جانتے لیکن اللہ انہیں ضرور جانتا ہے۔

اس آیت میں اللہ کے دشمنوں اور مسلمانوں کے دشمنوں کے خلاف زبردست تیاری کا حکم دیا گیا ہے۔ اور وہ تیاری بھی ایسی جس میں مسلمانوں کی پوری قوت شامل حال ہو، اور جس میں اس وقت کی ہر طاقت استعمال میں لائی گئی ہو، آیت میں انتہائی جامع اور معجز بیانی سے "من قوۃ ومن رباط الخیل" کا استعمال ہوا ہے۔ "من قوۃ" ہر قسم کی قوت کے لئے عام ہے جس میں افرادی قوت نمایاں ہے اور "رباط الخیل" سے سرحدوں کا دفاع مراد ہے جو اس زمانے کی جدید ترین اسلحہ ساز فیکٹریوں سے ممکن ہے۔ افرادی قوت کی تیاری میں، دورِ جدید میں جتنی اہمیت تعلیم کو حاصل ہے، کوئی دوسرا عنصر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ افرادی قوت کی تیاری میں ماضی، حال اور مستقبل میں تعلیم کا کردار باقی تمام عناصر کی نسبت سب سے زیادہ رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا، ماضی اور ماضی بعید میں تعلیم سے اس نظریہ حیات کو مجاہد کے قلب و دماغ میں بٹھانا مقصود ہوتا تھا، جس کی خاطر وہ میدان جنگ میں اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر نکلتا تھا، اس نظریہ حیات سے سرشاری اسے تلوار کی انی پر رقصاں کرتی تھی۔ اور اس نظریہ حیات سے مست ہو کر وہ کارہائے نمایاں انجام دیتا تھا۔ سرور کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانثاروں میں جہاد کا جذبہ اسی تعلیم کا مرہونِ منت تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ فرد کی تربیت کا مرکزی نقطہ، اسلامی نظریہ حیات سے واقفیت تھا۔ اسی معنوی قوت سے وہ محیر العقول کارنامے انجام دیتا تھا۔ آیت کریمہ: فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸ : ۱۷) میں اسی قوت کی طرف اشارہ ہے۔ معلوم ہوا کہ جب کسی قوم کو اس کے نظریہ حیات کی پوری طرح تعلیم دے دی جاتی ہے اور اس قوم کا ہر فرد اپنے نظریہ حیات کی تعلیم پر ایمان کامل پیدا کر لیتا۔ تو ایسے ادارے افواجِ قاہرہ پر غالب آجاتے ہیں "کم من فئۃ

قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ (۲ : ۲۴۹) اور تعلیم اور علوم و فنون سے عاری اقوام، لاتعداد افواج اور اسلحہ سازی کی زبردست فیکٹریوں کے باوجود شکست کھاکر مغلوب ہو جاتی ہیں۔ یہ اس لئے کہ لاتعداد افواج قاہرہ کے دلوں میں کوئی چیز وحدت فکر پیدا کرنے والی نہیں ہوتی۔ تحسبھم جمیعا و قلوبھم شتّٰی (۵۹ : ۱۴) آپ انہیں ایک سمجھتے ہیں حالانکہ ان کے دل الگ الگ ہیں۔ سب سے پہلی وحی "اقرأ" کی روشنی میں حضورؐ نے ہر فرد کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ آپؐ کے نصاب تعلیم سے آراستہ افراد جب بھی میدانِ کارزار میں پہنچے تو تعداد کی قلت فنون و اسلحہ حرب میں مد مقابل سے کم ہونے کے باوجود صرف ایمان و علم معنوی کی طاقت سے انہوں نے وہ کارنامہ انجام دیا جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ اسلام میں دفاع کے لئے اسلحہ سازی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن قرآنی نقطۂ نظر سے یہ معنوی قوت کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ "رباط الخیل" کو "من قوۃ" کے بعد رکھا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اس صریح حکم کے بعد کہ مسلمان اپنے دشمنوں کے خلاف پوری قوت تیار رکھیں اور یہ کہ اصل تیاری اسلامی نظریہ حیات کا فروغ اس کا ابلاغ عامہ ہے۔ اگر مسلمان قوم اپنے افراد کو جاہل رکھتی اور ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا کوئی انتظام اور ان کی نشو و نما اور تربیت کا اہتمام نہیں کرتی اور ایسی تعلیم کو رواج نہیں دیتی جو روح کو بالیدگی بخشے، باطن کے اسرار کھولے، اور قرآن کے حقائق کو عام کر دے تو ایسی قوم کے سربراہ اللہ کی نظر میں مجرم ہیں جنہیں نہ قوم معاف کرے گی نہ اللہ تعالیٰ۔ قوم کو دشمن کے مقابلہ میں تیار کرنے کی جو ترتیب اللہ رب العزت نے بیان کی ہے اس کو الٹنا اور مادی قوت کو معنوی قوت پر ترجیح دینا اسلام سے کفر کی طرف رجوع کرنے کے مترادف ہے۔ جو نظام مسلمانوں کو اس حالت میں رکھے کہ خود مسلمان اپنی جہالت اور عدم تربیت کی وجہ سے دشمنوں سے خوف کھائیں وہ نظام دشمنوں کا نمائندہ اور دوست کے لبادہ میں دشمن کا کام کر رہا ہے ایسے دوست نما دشمنوں کو کیفر کردار تک پہنچانا مسلمانوں کا فرض ہے۔

نسل کشی کے دو طریقے قتل بالسیف اور قتل بالجہالت

تعلیم، قوم کی حیات ہے اور جہالت اس کی موت ہے، جو حکومت یا معاشرۃ تعلیم سے اپنی رعایا یا افراد کو تعلیم سے دور

رکھے وہ دراصل قتل کا ارتکاب کرتا ہے۔ قتل دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک باقاعدہ کسی آلہ سے کسی شخص کا گلا کاٹنا اور دوسرے ایسے اسباب پیدا کرنا جو کسی فرد کے قتل و موت کا باعث بن جائیں، کسی شخص کا بازو کاٹ کر تن سے جدا کرنا یا اسے قوتِ نمو اور جوہرِ حیات سے عاری کر کے بے کار کر دینا، معنوی اعتبار سے دونوں ایک ہی طرح کے جرم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں تمام تعمیری صلاحیتیں پیدا کی ہیں، لیکن ان کی نشو ونما اور تربیت، معاشرے اور حکومت کا فرض ہے۔ اگر کوئی معاشرہ اور نظام، انسانیت کے جوہر کی تربیت نہیں کرتا، اور انہیں اسی ابتدائی حالت میں چھوڑے رکھتا ہے تو وہ ناقابل نا معافی جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اور انسان کو جو احسن تقویم میں پیدا ہوا ہے اسفل السافلین کی طرف گرانے لگتا ہے۔

"علم کا نور" اور "علم کی روشنی" اب تک بطور استعارہ استعمال ہوتے رہے ہیں لیکن دورِ جدید میں یہ باتیں استعارہ نہیں حقیقت بن چکی ہیں۔ اس لئے دورِ حاضر میں کسی قوم کو جاہل رکھنا پوری قوم کو تاریکی میں بند رکھنا اور ان کے اعضاء و جوارح تمام صلاحیتوں کو ضائع کر دینا ہے۔ ان کی آنکھوں کے نور اور کانوں کی سماعت پر ڈاکہ ڈالنا ہے۔ ان کی فکر و عقل و بصیرت اور دل و دماغ کی اعلیٰ صلاحیتوں کو چن چن کر ضائع کرنے کی باقاعدہ منصوبہ بندی ہے۔

یہ بات انتہائی مضحکہ خیز ہے کہ قوم کی جہالت کی ذمے داری خود قوم پر ڈال دی جائے اور اقتصادی و معاشی نظام کے ذمہ دار اس کی ذمے داری سے کنارہ کش رہیں۔ یہ انسانیت کے ساتھ کھلم کھلا مذاق ہے۔ انسانیت کے خلاف ظلم کی قبیح ترین صورت ہے۔ کسی ماں کا یہ عذر تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے بچے کا گلا نہیں دبایا بلکہ بچہ خود بخود اس لئے مر گیا کہ اسے کھانے کو کچھ نہیں دیا گیا۔ اور بیماری میں اس کا علاج نہیں ہو سکا اور موسم کی سختیوں سے اسے بچایا نہیں گیا۔ جس طرح ایک ماں اپنی جملہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہ ہو تو باوجود گلا نہ گھونٹنے کے وہ قتل کی مجرم ہے۔ اسی طرح حکومت یا معاشرہ پوری قوم کی جہالت اور اپاہج پن کے ذمّے دار ہوتے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب کسی جوہر کی صحیح تربیت کر کے اسے اس کام پر نہ لگایا جائے جس کے لئے خالق نے اسے پیدا کیا تھا تو یقیناً اس جوہر میں تعمیر کی بجائے تخریب پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان جو بنیادی طور پر تعمیری صلاحیتیں لے کر دنیا میں آتا ہے اسے تخریب پر ڈالنے کی ذمہ داری نظام پر عائد ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ قوم کے ساتھ منفیانہ رویہ اختیار کرنے سے کوئی نظام یہ کہہ کر بری الذمہ نہیں ہو سکتا کہ اس نے تو قوم

کو جرائم پیشہ نہیں بنایا جبکہ اس نے اسے جاہل اور غیر تربیت یافتہ رکھ کر جرائم کا عادی بنایا ہے۔ حضرت عمرؓ نے چور غلاموں کے ہاتھ کاٹنے کی بجائے نادہندہ آقا سے کہا تھا کہ اگر آئندہ انہوں نے چوری کی تو ان کی بجائے تمہارا ہاتھ کاٹوں گا۔

نا سمجھ انسان حیوان سے بدتر ہوتا ہے...

قرآن حکیم علم و فضل اور عقل و فکر سے عاری افراد و اقوام کو حیوانوں اور چوپایوں سے بھی بدتر قرار دیتا ہے اور اس کے نزدیک جو لوگ معنوی سماعت و بصارت سے محروم ہیں اور جو سننے اور سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں وہ "شر الدواب" بدترین قسم کے حیوان ہیں۔ ان شر الدواب عند اللہ الصم البکم الذین لا یعقلون (۸: ۲۲) اللہ تعالیٰ کے نزدیک زمین پر چلنے والے جانوروں میں سب سے بدتر حیوان وہ انسان ہیں، جو بہرے اور اندھے ہیں اور جنہیں عقل و فکر سے کام لینا نہیں آتا۔ عقل و فکر سے عاری انسان، حیوان سے بھی نچلی سطح پر اس لئے گر جاتا ہے کہ انسان کے پاس پیدائشی طور پر عقل و فکر کا جوہر موجود ہوتا ہے، لیکن جب عقل و فکر کے جوہر کو تعلیم و تربیت کے ذریعے جلا نہیں پہنچتی تو وہ وہی ذہانت رذیل حرکات کی طرف مڑ جاتی ہے۔ اور اب اخلاقی پستی اور تخریبی کاروائیوں میں، جب ایسے انسان کا مقابلہ حیوانوں کے ساتھ ہوتا ہے، تو حیوان ایسے انسان سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ انسان کو "شر الدواب" کی سطح پر گرانے والا دراصل وہ نظام حکومت یا معاشرہ ہوتا ہے۔ جس پر بحیثیتِ مجموعی انسانوں کی عقل و فکر کو تربیت دے کر انھیں احسن تقویم پر قائم رکھنے کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

قرآن حکیم جہالت کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، وہ لوگ جنہیں علم و فن کی سہولتیں میسر ہونے کے باوجود علم سے محروم رکھا جاتا ہے، آنکھیں ہونے کے باوجود ان کی بصارت کی تربیت نہیں کی جاتی، اور کان ہونے کے باوجود ان کی سماعت کو غیر تربیت یافتہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ قرآن مجید انہیں حیوانوں سے زیادہ گمراہ قرار دیتا ہے "ام تحسب ان اکثرھم یسمعون او یعقلون ان ھم الا کالانعام بل ھم اضل سبیلا (۲۵: ۴۴) کیا آپ کا خیال ہے کہ ان میں سے اکثر سنتے اور سمجھتے ہیں، وہ تو محض چوپائے ہیں، نہیں نہیں وہ تو ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ دوسری آیت میں "شر الدواب" کو کافر قرار دیا اور بتایا کہ یہ ان کی جہالت اور علم و فضل سے دوری، اسے ایمان جیسی نعمت تک نہیں پہنچنے دیتی۔ ان شر الدواب عند اللہ الذین کفروا فھم لا یومنون (۸: ۵۵) اللہ کے نزدیک

بدترین حیوانوں میں سے وہ انسان ہیں جن کی جہالت انہیں صحیح تعلیماتِ اسلامی تک پہنچنے نہیں دیتی اور وہ کفر کی تاریکی میں پڑے رہتے ہیں، اس لئے وہ ایمان لانے سے قاصر رہتے ہیں۔ ایک موقع پر فرمایا: کذالک انما یخشی اللہ من عبادہ العلمٰؤا (۳۵:۲۸) اس کی رو سے خوفِ خدا اور اصل انسانیت صرف انہیں لوگوں کو میسر ہے۔ جو علم و فضل والے ہوں۔ قرآن حکیم نے ایسے ہی مجرمین کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔ لھم قلوب لا یفقھون بھا (۷:۱۷۸) ان کے سینوں میں دل تو ہیں، لیکن انہیں چونکہ سوچ بچار اور افہام و تفہیم کی صلاحیت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اس لئے وہ ان سے سمجھ کا کام نہیں لے سکتے۔ افلم یسیروا فی الارض فتکون لھم قلوبٌ یعقلون بھا او اذان یسمعون بھا۔ فانھا لا تعمی الابصارُ ولٰکن تعمی القلوب التی فی الصدور (۲۲:۴۶) کیا ان لوگوں نے زمین پر چل کر نہیں دیکھا، اگر ان کے دل ہوتے تو وہ ان سے عقل و تفکر کا کام لیتے اور اگر ان کے کان ہوتے تو وہ ان سے سننے کا کام لیتے لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ ان کی آنکھیں تو اندھی نہیں دراصل وہ تو دل کے اندھے ہیں، اسی لئے ان کے دل جو سینوں میں دھڑک رہے ہیں وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ اولٰئک الذین لعنھم اللہ فاصمھم واعمیٰ ابصارھم (۴۷:۲۳) یہی لوگ ملعون ہیں جنہیں جسمانی کانوں کے باوجود معنوی سماعت سے محروم کر دیا گیا ہے اور جن کی ظاہری آنکھیں ہونے کے باوجود ان سے معنوی اور حقیقی بصارت چھین لی گئی ہے۔

اس دور میں جب کہ غیر مسلم اقوام صحیح معنوں میں سیاروں پر کمندیں ڈال رہی ہیں۔ اور چاند اور دوسرے سیاروں کو مسخر کرنے میں زبردست کامیابیاں حاصل کر چکی ہیں۔ مسلم دنیا تاریکی و جہالت میں بھٹک رہی ہے۔ مغرب کی ترقی کا راز صرف اس میں ہے کہ اس نے انسانی اعضاء و جوارح کی پوری طرح نشوونما کی، ان کی اچھی طرح تربیت کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انھیں فضا میں معلق سیاروں کی ہر چیز زمین پر بیٹھے نظر آرہی ہے انہوں نے معاشرتی، سائنسی اور تکنیکی علوم میں اتنی دسترس حاصل کر لی ہے کہ وہ زمین پر بیٹھے چاند پر بات کر سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنی قوم کے ہر فرد کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا، نتیجۃً ان میں اعلیٰ سے اعلیٰ دماغ پیدا ہونے لگے۔ انھوں نے تعلیم کو عام کیا تو ان کی مجموعی بصارت میں زبردست اضافہ ہو گیا، باطنی صلاحیتوں کی تربیت کا اثر یہ ہوا کہ ان کی مجموعی بصیرت میں لامتناہی ترقی ہوئی اور بصارت و بصیرت کے اس مجموعے مل کر ایسی ترقی کی کہ وہ قوم جسے کفار کو خائف کرنے کا حکم دیا گیا تھا، خود ڈری سہمی ہوئی اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے دشمنوں سے حیات و امن کی

بھیک مانگتی پھر رہی ہے غیر مسلم اقوام نے اپنے افراد کی اکثریت کو تعلیمافتہ کرنے جو مقام حاصل کیا وہ اس بات پر گواہ ہے کہ انسان کے ظاہری و باطنی اعضاء و جوارح کی تربیت و نشو و نما اسے اس قابل بنا سکتی ہے کہ وہ اپنی چشم بصیرت سے چاند اور مریخ جیسے بڑے بڑے سیاروں کی ہر چیز کا زمین پر بیٹھے مشاہدہ کرے ۔ ان کی تسخیر پر شب و روز مصروف ہو جائے ۔ لیکن اسی دنیا میں مسلم اقوام اب تک بصارت و بصیرت سے محروم پڑی ہیں ۔ وہ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھی، کان رکھتے ہوئے بھی بہری اور دل و دماغ رکھتے ہوئے بھی عقل و فکر سے عاری ہیں ۔

حضورؐ نے مشرکین کو معلم کا مقام عطا کیا

مسلمان ممالک کے ذمے دار لوگ غیر مسلم ممالک کی نسبت اس جرم جہالت کے بطور خاص مجرم ہیں ۔ مسلمان قوم کو تعلیم کی طرف توجہ دینے کی اہمیت اس طرح واضح کی گئی تھی کہ اسے خالق و مالک کی معرفت پر بھی فوقیت حاصل ہے ۔ سب سے پہلی وحی علم و عرفان کے حصول سے شروع ہوتی ہے، اور بتدریج اللہ رب العزت کی معرفت کی طرف توجہ دلاتی ہے ۔ قرآن پاک کی اس سب سے پہلی وحی کے نزول سے لے کر سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری سانس تک مسلسل تیئیس ۲۳ برس، دنیا کی اجہل ترین عرب قوم کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے کے بیشمار طریقے اپنائے گئے ، اور حکومت کی طرف سے ایسے ایسے ذرائع عمل میں لائے گئے کہ ان ذرائع کی مثال آج بیسویں صدی کے ربع آخر میں بھی کوئی قوم پیش کرنے سے قاصر ہے ۔ جنگِ بدر میں جو مشرکین بطور جنگی قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے ۔ ان میں سے وہ لوگ جو پڑھے لکھے تھے اور علم کی روشنی پھیلانے کی اہلیت رکھتے تھے، باوجودیکہ وہ اللہ، رسولؐ اور مسلمانوں کے جانی دشمن تھے اور اسلام کو بیخ و بُن سے اکھاڑنے کے لئے مدینہ پر چڑھ آئے تھے، حضور اکرم صلعم نے ان جنگی قیدیوں کے ساتھ اس دستور پر سلوک کرنے سے انکار کر دیا ، جس پر قبل از اسلام، بعد از اسلام اور آج تک مختلف اقوام عمل پیرا رہی ہیں ۔ آپ نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ علم جہاں بھی ہو روشنی ہے اس سے آنکھوں میں بصارت پیدا ہوتی ہے ۔ ذہن و دماغ میں جلا پیدا ہوتی ہے ۔ اس لئے علم کے حامل خواہ مشرکین ہی کیوں نہ ہوں، خواہ اللہ اور رسولؐ کے جانی دشمن ہی کیوں نہ ہوں ۔ ان کی علمی صلاحیت سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے ۔

حاملین علم کو مشرکین ہونے کے باوجود معلّم کے محترم مقام پر فائز کیا گیا اور علم سے محروم کے لئے خواہ وہ مومنین اور ان کی اولاد ہی کیوں نہ تھی، مشرکین کی شاگردی اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہ

سمجھی۔ رسول اکرم صلعم کی یہ درخشندہ مثال آپ کی ان لامحدود امثلہ میں سے ایک ہے۔ جو آپ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے کی خاطر قائم فرمائیں۔ قرآن، تفسیر، حدیث لغت، ادب، تاریخ اور دوسرے فنون کی کتب کا مطالعہ یہ بات واضح کردے گا کہ رسول اکرم صلعم کے نزدیک علم کے حصول کی کتنی اہمیت تھی۔ اور آپ نے کس طرح صحابہ کرام کو غیر اقوام کی زبانیں اور دیگر علوم و فنون حاصل کرنے کے لئے ترغیب دلائی اور اس کے لئے عملی اقدام فرمائے۔

تعلیم بنیادی ضروریات زندگی میں سے ایک ہے

اب تعلیم زندگی کی بنیادی ضروریات میں داخل ہو چکی ہے۔ زراعت آج سے کچھ عرصہ قبل روایتی طرز پر کی جاتی تھی اور اس کے لئے کسی سند یا ڈگری کی ضرورت نہ تھی۔ اس وقت اس کی وہ کیفیت باقی نہیں رہی۔ سائنسی اور تیکنیکی ایجادات نے زراعت میں اتنا بڑا انقلاب پیدا کردیا ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے کسان کو بھی تعلیم حاصل کئے بغیر اس انقلاب کا ساتھ دینا مشکل ہے۔ دوسرا بڑا عامل یہ ہے کہ سائنسی اور تیکنیکی علوم نے زراعت کی وہ اجارہ داری ختم کردی ہے جو آج سے کچھ عرصہ قبل اسے سب سے بڑے روزگار کے طور پر حاصل تھی۔ جدید صنعتی انقلاب نے زراعت کی اس حیثیت کو کافی حد تک متاثر کیا ہے۔ اور اب صنعت، روزگار کی حیثیت سے اگر زراعت کے برابر نہیں تو کم از کم زراعت کے بعد اسی کا مقام ہے۔ روزگار کے اتنے بڑے ذریعے کے لئے تعلیم ناگزیر ہو گئی ہے۔ جس طرح آج کا کسان تعلیم کے حصول کے بغیر زراعت میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کرسکتا اسی طرح آج کا مزدور بھی سائنسی اور تیکنیکی علوم کے حصول کے بغیر مشینی و صنعتی میدان میں کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتا۔ زراعت و صنعت وہ بنیادی ادارے ہیں جو روز اول سے انسانیت کو روزگار مہیا کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن دورِ جدید نے ایسے حالات پیدا کردیئے ہیں کہ آج کی ایجاد کل کے معمولات میں سے معلوم ہونے لگتی ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے چاند کا سفر معجزات میں سے شمار ہوتا تھا۔ لیکن جب ۱۹۶۹ء میں وہی کارنامہ انجام دیا جارہا تھا تو دنیا بھر کے لوگ اس کی ایک ایک لمحے کی خبریں سن کر حیران ہو رہے تھے۔ بعد میں اسی سفر پر جب خلانورد حادثے کا شکار ہوتے ہوتے بچے تو ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے لاہور سے پنڈی جاتے ہوئے کار میں کوئی معمولی خرابی پیدا ہو گئی ہو۔ علوم و فنون میں ترقی کی یہ برق رفتاری اس بات کی مقتضی ہے کہ ملک کے گوشہ گوشہ میں علوم و فنون کے اس کثرت سے مراکز قائم ہوں کہ ہر انسان لمحہ بہ لمحہ ہونے والی ایجادات و

ترقیات سے پوری طرح واقف رہے اور پھر اپنے علم وتجربہ کی بنا پر ان میں اضافہ کرتا چلا جائے لیکن شومیٔ قسمت دیکھئے کہ جس قوم کی تعلیم وتدریس کا آغاز "اقرأ" کی وحی الہٰی نے کیا تھا ۔ دورِ جدید کے معاشی وطبیعاتی علوم کے مقابلے میں بالکل اپاہج ہوکر رہ گئی ہے ۔ اس کا حامل ومبلغ خود جہالت کی اتھاہ گہرائیوں میں پڑا ہوا اپنے آپ کو سب سے بڑا معلم خیال کرتا ہے ۔ خود لاعلاج بیماریوں میں گرفتار ہے ۔ لیکن پوری انسانیت کو بیمار قرار دے کر ان کا معالج بننے کا دعویدار ہے ۔

جہالت کا ذمے دار موجودہ معاشی نظام

اس تباہ کن صورت حال کی سب سے بڑی ذمے داری مسلمانوں کے موجودہ اقتصادی ومعاشی نظام پر عائد ہوتی ہے ۔ اس نظام میں دنیا جہان کے نظاموں کی برائیاں بدرجہ اتم موجود ہیں اور روئے زمین کے نظاموں کی کسی خوبی کو اس میں کوئی دخل نہیں ۔ اس نظام میں نہ قرونِ وسطیٰ کے کسی نظام کی خوبی موجود ہے، نہ دورِ حاضر کے نظاموں میں سے سرمایہ داری، اشتراکیت اور کمیونزم کی خوبیوں میں سے کوئی اچھا عنصر شامل ہے ۔ اس وقت مسلمانوں میں جہالت قائم رکھنے کی سب سے بڑی ذمے داری موجودہ اقتصادی نظام پر عائد ہوتی ہے ۔ اس نظام کا منشائے اولین یہ ہے کہ مسلمان جاہل رہیں، جاہل رکھنے والوں کو یہ فوائد حاصل ہوتے ہیں کہ وہ بیسویں صدی کے ربع آخر میں وہ کردار انجام دے سکتے ہیں ۔ جو زمانہ قبل از تاریخ کے مطلق العنان فرعون انجام دیا کرتے تھے ۔ ظاہر ہے یہ صورت اس حال میں ممکن ہے جب لوگ جاہل رہیں ۔ مسلمانوں کا سوادِ اعظم جاہل رہیگا تو انہیں ان کے اپنے دین اور ان کے اپنے مذہب کے نام پر غیر مسلم بنایا جا سکے گا ۔ مسلمان کا طرۂ امتیاز دنیا میں عدل قائم کرنا اور ظلم کے آگے سینہ تان کر کھڑے ہو جانا ہے ۔ لیکن یہ جذبہ اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے ۔ جبکہ اسے اپنے دین اور اپنے مذہب کی صحیح اور سچی تعلیمات کا علم ہو، وہ اللہ رب العزت کی ہدایات سے متعارف ہو اور وہ نبی اکرم صلعم کی سنّت سے پوری طرح آگاہ ہو، لیکن موجودہ معاشی نظام کے ذمے داروں کے لئے یہ صورت حال بڑی ہی تباہ کن ثابت ہوگی ۔ عامۃ المسلمین کو تعلیم یافتہ بنانے کا دوسرے لفظوں میں مطلب یہ ہوگا کہ ظالم خود اپنی موت کے وثیقے پر دستخط کرے، وہ خود مسلمان کو اس قابل بنائے کہ وہ ظلم وجور کو نیست ونابود کردے، بے انصافی اور استحصال کا قلع قمع کردے، اور ظلم، بے انصافی، استحصال کا خاتمہ خود ۔

اس نظام کے ذمہ داروں کا خاتمہ ہے، یہی وجہ ہے کہ موجودہ معاشی نظام کے ذمے دار مسلسل اس کوشش میں ہیں کہ دورِ جدید میں جب کہ علوم و فنون کا سیلاب آگیا ہے وہ مسلمانوں کے گرد جہالت کا وسیع و مستحکم حصار بنادیں تاکہ علم کسی طرح ان تک نہ پہنچ سکے۔ اس نظام کے ذمہ دار افراد کی ذہانت کی داد دیجئے کہ انہوں نے چن چن کر ان ذرائع سے ان پروگراموں کو خارج کردیا ہے جن سے جاہلوں کو علم ملے اور بے خبروں کو معرفت حاصل ہو،

جاہلوں کی موثر ترین ذریعۂ تعلیم، ٹیلیویژن سے محرومی

اس نظام کے ذمہ داروں کی اسی پالیسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں جو ایجاد بھی عوام کی بھلائی کے کام آسکتی ہے ہمارے ارباب حل و عقد انتہائی ذہانت اور چابکدستی سے اس پر اس طرح اجارہ داری قائم کرتے ہیں کہ عامۃ المسلمین اس سے کسی طرح بھی مستفید نہ ہوسکیں۔ تعلیم کے لئے دورِ حاضر کی سب سے عمدہ و مفید ایجاد ٹیلیویژن ہے ہمارے ملک میں اسے متعارف کرواتے وقت یہی دلیل دی گئی تھی کہ یہ تعلیم و تدریس کا سب سے اچھا عمدہ اور موثر ذریعہ ہے۔ لیکن دیہات جہاں جہالت تھی، وہاں سے آخری پیسہ تک آبیانے اور دوسرے ٹیکسوں کے نام پر وصول کر کے ملک کی تقریباً نوے فیصد آبادی کو موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا کردیا، پھر دیہات میں پھیلے ہوئے ان کروڑوں جاہل غلاموں کو زندگی کے اس موڑ پر لاکھڑا کیا کہ وہ بجائے حصول تعلیم کے زندگی کی بھیک مانگنے پر مجبور ہوگئے۔ ٹیلیویژن کی اگر کوئی تعلیمی افادیت ہے تو اس کی سب سے بڑی ضرورت اور اس کا سب سے بڑا تقاضہ دیہات ہیں۔ اس لئے ٹیلیویژن کے استعمال پر دیہاتیوں کو فوقیت دی جائے اس طرح کہ ٹیلیویژن کے دو ایک سیٹ ایک متوسط گاؤں کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مہیا کئے جائیں۔ اور ان پڑھ دیہاتیوں کو ٹیلیویژن کے ذریعے دورِ جدید کی مفید معلومات و ایجادات اور ان کے استعمال سے بآسانی روشناس کرایا جائے۔

واقعی اگر ٹیلیویژن ایک عیاشی نہیں بلکہ ضرورت ہے تو اس سے ناخواندہ دیہاتیوں کو کیوں محروم رکھا گیا ہے

جہالت کا بنیادی سبب دیہات سے بے اعتنائی

موجودہ اقتصادی و معاشی نظام کا تقاضا یہ ہے کہ صرف شہروں میں بسنے والی اقلیت تعلیم حاصل کرسکے، دنیا کے تمام علوم کا تجربہ صرف شہروں میں کیا جائے۔ ظلم کی انتہا ہے کہ شہر میں تعلیمی طوفان ہو، اور دیہات زمانہ قبل از تاریخ کی طرح جہالت

میں ڈوبا رہے۔ شہر میں تعلیم کے لئے میونسپل کمیٹیوں، کارپوریشنوں، کنٹونمنٹوں، انجمنوں اور گورنمنٹ کے تعلیمی اداروں کی بھرمار ہے، کیڈٹ کالج، ٹریننگ سنٹر، انجنیئرنگ، میڈیکل اور قانون کے مراکز ہیں۔ عام تعلیم کی منصوبہ بندی ہو، یا سائنسی اور تکنیکی تعلیم کی پلاننگ، طبی و فنی علوم کی بات ہو یا ٹریننگ اور تربیت کے مراکز کی سوچ بچار، ہر اعتبار سے شہر کو اولیت حاصل ہے۔
گویا موجودہ اقتصادی و معاشی نظام کے کارکنان نے ملک کی اقتصادیات اور معاشیات پر اجارہ داری قائم کر کے منصوبہ بندی کرنے والوں کے لئے یہ لازمی قرار دے دیا ہے کہ صرف شہریوں کو تعلیم اور علوم و فنون کی اقسام سے آراستہ کیا جائے۔ اور دیہاتیوں کو روزمرہ کی زندگی میں کام آنے والے حساب و کتاب کی تربیت کا اہتمام کرنے کو ملکی وسائل کی کمی اور ملک کی عام پسماندگی سے تعبیر کر کے کروڑہا انسانوں کو قصداً جاہل اور ان پڑھ رکھا جائے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اگر اس محروم و مظلوم اکثریت کو اپنی محرومی و مظلومی کا احساس ہو گیا تو بیسویں صدی کے ربع آخر میں وہ اپنے انتقام کے لئے کیا صورت اختیار کرے اور محمد رسول اللہ ﷺ کی امت کے سواد اعظم کو جاہل اور ان پڑھ رکھنے والے نظام کے ذمے داروں کے خلاف کیا قدم اٹھائے۔

کامیابی و ترقی کا راز دیہات کو تعلیم دینے میں ہے

سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس عہد میں مسلمانوں کی ترقی کے لئے لازمی ہے کہ دیہات کو پوری توجہ سے تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جائے۔ وسیع پیمانہ پر عام یا فنی و تیکنیکی تعلیم کا رخ دیہات کی طرف موڑ دیا جائے تا کہ " فریضۃ من اللہ " مسلمانوں کو تعلیم یافتہ بنانے کے الٰہی فرمان کی صحیح تعبیر ہو جائے اور جب تک کوئی حکومت اور کوئی نظام ملک کے ہر فرد کو تعلیم یافتہ نہیں بنا لیتا، اللہ کا یہ حکم اس سے اپنی تکمیل کا مسلسل تقاضا کرتا رہیگا۔ دیہات کا ذہن تازہ، قویٰ مضبوط اور صلاحیتیں لامحدود ہیں۔ اس میں کام کی لگن، محنت و مشقت کی عادت، تعمیر و ترقی کی طرف رغبت اور راست اقدام کی تڑپ موجود ہے۔ اس کی صلاحیتیں جدید افکار و خیالات کی جلاء چاہتی ہیں۔ اس کا دماغ وسعت نظر کا متلاشی ہے۔ اس کی ظاہری و باطنی قوتیں اجاگر ہونا چاہتی ہیں۔ ایک ملک گیر تعلیمی پروگرام کے تحت دیہات کو سدھارنے اور ترقی دینے کا تہیہ کر لیا جائے تو اس کی یہی صلاحیت ملکی تعمیر کے کام آ سکتی ہیں۔ اس وقت نہ صرف مسلمان ممالک بلکہ پورے ایشیا اور افریقہ کی تعمیر و ترقی کا راز دیہات کی ترقی و تعلیم میں پوشیدہ ہے۔ ایشیا اور افریقہ کے جن ممالک نے

اس راز کو پالیا ہے انہوں نے یوروپ و امریکہ کو چند سالوں میں جالیا ہے

مقابلے کے امتحانات اور دیہات

کہا جاتا ہے کہ انجینیر، ڈاکٹر، پروفیسر، فوج اور سول کی اعلیٰ ملازمتوں کے لئے کھلے مقابلے کے امتحانات ہوتے ہیں اور یہ مقابلے کے امتحان جس طرح شہریوں کے لئے کھلے ہیں اسی طرح دیہاتیوں کے لئے بھی ہیں۔ ہر وہ شخص جو ایک خاص حد تک تعلیمی لیاقت رکھتا ہو اسے ایسے امتحانات میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے' اور اس میں دیہاتی یا شہری کی کوئی تفریق نہیں۔ یہ بات بظاہر جتنی خوبصورت اور عدل و انصاف پر مبنی نظر آتی ہے۔ بباطن اتنی ہی مکروہ ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ایسے امتحانات کے لئے ایک خاص غیر ملکی زبان لازمی ہے' جس میں دسترس حاصل کرنا' ایک طبقے کے لئے مخصوص ہے۔ کون نہیں جانتا کہ جو خاص تعلیمی لیاقت ایسے امتحانات کے لئے ضروری ہے' اس کے لئے شہری اپنے بچوں کو ابتداہی سے اس مقصد کے لئے قائم ہونے والے انگلش میڈیم اسکولوں سے فائدہ اٹھا کر اپنی ضرورت پوری کر لیتے ہیں۔ کسی دیہاتی میں اتنی ہمت کہاں کہ وہ اپنے بچے کو ایسے اداروں میں تعلیم دلوا سکے۔ ظاہر ہے کہ جو بچہ کے۔ جی سے لے کر بی۔ اے تک اس امتحان کے لئے موزوں ماحول میں تربیت پاتا ہے اس کے مقابلہ میں سندھی۔ پنجابی۔ پشتو' بلوچی اور بنگالی میں ناتجربہ کار اساتذہ کی زیر تربیت ناسازگار حالات میں ابتدائی تعلیم پانے والے بچے کیونکر سبقت لے جا سکتے ہیں۔

ضروری ہے کہ دیہات اور شہر کے بچوں کو یکساں سہولتیں میسر ہوں۔ ایک جیسا ماحول دستیاب ہو' تعلیم و تربیت کا یکساں معیار ہو' امتیازی زبان ختم کر دی جائے۔ قومی اور ملکی زبانیں مقابلے کے امتحان کی زبانیں قرار پائیں۔

جہالت کے انسداد کا مؤثر طریقہ زکوٰۃ کا نفاذ

موجودہ حالات میں جہالت کے مسئلے کو ہنگامی صورت حال کے تحت حل کرنے کی کوشش کی جائے اور نظام زکوٰۃ کے تحت اس مسئلہ کو اس نقطہ (دیہات) سے حل کرنا شروع کیا جائے جہاں اس کا گڑھ ہے۔ ہر علاقے کی زکوٰۃ جمع ہو کر اسی علاقے پر خرچ ہو' اور نظام زکوٰۃ کے تحت ملکی معیشت کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ دولت کی تقسیم دیہات و شہر میں مساوی ہو' دیہات کی دولت' دیہات میں رہے' تو کوئی پیشہ ور دیہات میں خدمت کرنے کو عار نہ سمجھے گا۔ دیہاتی اپنی دولت دیہات کی تعمیر و ترقی میں لگائیں گے' اور نتیجۃً تعلیم و تربیت کا ایک سنہرا اور تابناک دور شروع ہوگا' وہاں کا بچہ بچہ تعلیم حاصل کرے گا اور آسودگی کے باعث خوشگوار

تعلیمی ماحول پیدا ہو جائے گا۔ اچھے اساتذہ کی خدمات حاصل کی جا سکیں گی۔ زکوٰۃ فنڈ سے تعلیمی اداروں کی عمارتیں تعمیر کی جا سکیں گی۔ بیکاری اور معاشی غلامی کے انسداد کی وجہ سے ہر شخص فارغ البال ہو کر تعلیم و تربیت پر زیادہ سے زیادہ توجہ دے سکے گا۔ اسے اپنے بچوں کو تعلیم کیلئے دُور بھیجنے کا بھی خطرہ نہ رہے گا۔ اور دیہات کی پوری آبادی ملک کی تعمیر و ترقی میں مصروف ہو جائیگی۔

جہالت کے انسداد کی بحث ختم کرنے سے پہلے مناسب ہو گا کہ نصابِ تعلیم کا تذکرہ بھی کر دیا جائے کیونکہ اس کے مطابق تعلیم کے نتائج نکلیں گے۔

قدیم و جدید نصابہائے تعلیم میں ہم آہنگی کی ضرورت

اس وقت ملک میں دو قسم کے نظامِ تعلیم رائج ہیں۔ (۱) جدید نظامِ تعلیم جسے حکومت نے، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نافذ کر رکھا ہے۔ (۲) قدیم مذہبی نظامِ تعلیم جو عربی مدارس میں رائج ہے۔ جدید نظامِ تعلیم کا مقصد ملک میں ایسے افراد پیدا کرنا ہے جو برطانوی سامراج و استعمار کے سچے جانشین کی حیثیت سے اپنے انگریز آقاؤں کی روایات کی سختی سے حفاظت و نگہداشت کر سکیں، ملکی اور اسلامی اقدار کے احیاء اور ان کی مقبولیت کے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہو سکیں۔ البتہ بالواسطہ اس نظامِ تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ طلبہ کو ان جدید معاشرتی اور سائنسی علوم سے روشناس کرائے جنہیں مغرب نے اپنے جدید مسائل حل کرنے کے لئے اپنے تعلیمی اداروں میں رائج کر رکھا ہے۔ قدیم مذہبی نظامِ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کو زمانۂ وسطیٰ کے اس نصابِ تعلیم کو پڑھائیں جو زوال بغداد سے پہلے کے مسائل حل کرنے کے لئے وجود میں آیا تھا سقوطِ بغداد سے ان حالات کا تقریباً خاتمہ ہو گیا جو اس سے قبل مسلمان ممالک میں تھے۔ اور تاریخی عوامل نے ماضی سے مختلف حالات پیدا کر دیئے تھے۔ بدلے ہوئے حالات کا تقاضا تھا کہ نئے حالات کے پیش نظر نصاب تعلیم کو نئے سرے سے مرتب کیا جاتا لیکن چونکہ بدقسمتی سے مسلمانوں کے فکری انحطاط کی وجہ سے ان کا سیاسی زوال وقوع پذیر ہوا تھا، اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ مسئلے کی اہمیت کا پورا پورا شعور حاصل کرتے۔ چنانچہ وہ نصابِ تعلیم کو نئے تقاضوں کے مطابق ترتیب دینے میں ناکام رہے۔ حالات کا تقاضا تھا کہ نصابِ تعلیم میں ایسے مضامین اور علوم کا اضافہ کیا جاتا جو بدلے ہوئے حالات سے مطابقت رکھتے، اور ان مضامین کو خارج کر دیا جاتا جو اپنی معنویت و افادیت ختم کر چکے تھے۔ یہی وہ تاریخی نقطہ ہے جہاں مسلمانوں کے فکری ارتقاء میں جمود پیدا ہو گیا اور بہت سے علوم مثلاً یونانی

فلسفہ ومنطق وغیرہ جنہیں سلف غیر اسلامی قرار دے چکے تھے، اور بعد میں حالات کے دباؤ کی وجہ سے نصاب میں داخل کئے گئے تھے، اب عین اسلامی علوم قرار پاگئے، اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ان کے تقدس میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان میں تبدیل و اضافہ خود اسلام میں تغیر و اضافہ سمجھا جانے لگا۔

اگرچہ تاریخی قوتوں نے مسلمانوں کے ذہنی وفکری ارتقاء کو روک دیا اور ان کا نصاب تعلیم حالات کی مناسبت سے مکمل تعطل کا شکار ہوگیا، لیکن دوسری طرف حالات نت نئے مسائل پیدا کرتے چلے گئے اور مسلمانوں کا نصاب تعلیم اسی تناسب سے پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ نت نئے تقاضوں کے مطابق جدت و ندرت پیدا ہونے کے بجائے قدامت اور رجعت بڑھتی چلی گئی۔ اسی دوران مغرب نے ایک نئے طرزِ حیات کی بنیاد رکھی، اور نئے طرزِ زندگی کے نئے حالات و مسائل حل کرنے کے لئے جدید افکار ابھریں۔ مغرب اپنی سیاسی و اقتصادی برتری کے ساتھ اپنے مسائل اور ان کے حل مسلمان ممالک میں لایا، اس طرح مغرب کے سیاسی و اقتصادی تسلط سے اس کے مسائل اور ان کے حل مسلمان ممالک پر مسلط ہوگئے، اور مسلمانوں کا اپنا نصاب تعلیم عملاً معطل ہو کر رہ گیا، مسلمانوں کا قدیم نصاب تعلیم پس منظر میں چلا گیا اور حکومت کی بجائے پرائیویٹ معاملہ بن کر رہ گیا۔ چنانچہ ہمارا موجودہ دوہرا نظام تعلیم ان حالات کی پیداوار ہے۔

اس وقت یہ دونوں نظام تعلیم ہمارے ہاں رائج ہیں اور دونوں عوام کے سرمایہ سے چل رہے ہیں۔ حکومت عوام سے انکم ٹیکس کے نام پر رقوم جمع کرتی ہے، اور علماء زکوٰۃ (مذہبی ٹیکس) کے نام پر۔ عوام دونوں ٹیکس دینے پر مجبور ہیں۔ حکومت کی وصولی کے پیچھے پولیس اور فوج کی طاقت ہے۔ جب کہ علماء کی وصولی کے پیچھے مذہب کی طاقت موجود ہے۔ تعلیم کے نام پر دوہرے ٹیکس کا نظام عوام الناس کے لئے ناقابل برداشت ہوتا جارہا ہے۔ اور شاید مستقبل قریب میں، ان کے لئے دونوں ٹیکسوں کے ساتھ وفادار رہنا مشکل ہوجائے۔ اگر جلد ہی کوئی ایسا جامع نظام تعلیم مرتب نہ کیا گیا تو عامۃ المسلمین اس بات پر مجبور ہوجائیں گے کہ اس دوہرے ٹیکس سے نجات حاصل کرنے کے لئے وہ خود ہی کوئی طریقہ ایجاد کرلیں۔

دونوں نظامہائے تعلیم اپنے اغراض و مقاصد کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دونوں نظامہائے تعلیم دو مختلف ذہن پیدا کر رہے ہیں۔ نقطہ نظر کا یہ اختلاف ہمارے ہاں ذہنی، نفسیاتی، معاشرتی، سیاسی، اقتصادی اور قانونی انتشار، افتراق اور انارکی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ ملک

کی ترقی کے لئے یونیورسٹی کے فارغ التحصیل علماء کی طرف سے بنایا ہوا کوئی منصوبہ مدرسہ کے فارغ التحصیل علماء کے لئے لازماً تکلیف دہ ہوتا ہے۔ صوبائی اور قومی اسمبلی میں بننے والے ہر قانون کی مخالفت "مدرسہ" کا فرض اولین ہے۔ "یونیورسٹی" اور "مدرسہ" دو اسلحہ ساز فیکٹریوں کی طرح اپنی اپنی پیداوار میں مسلسل اضافہ کر رہے ہیں۔ اسلحہ کی فراوانی کے باعث نظریاتی جنگ بلا انقطاع جاری ہے۔ دراصل اس تکلیف دہ اور افسوسناک صورت حال کا نتیجہ ہے کہ پاکستان کوئی مستقل آئین بنانے میں ناکام رہا ہے۔ اور ہمارے ہاں نظریاتی اختلاف کا سبب بھی یہی ہے، اور اسی وجہ سے ہم کسی متفقہ نظریہ حیات اپنانے میں ناکام رہے ہیں۔

ان دو متضاد اور خود مختار نظام ہائے تعلیم کی موجودگی میں کسی متحدہ قومی نقطہ نظر کا ظہور پذیر ہونا ناممکن ہے اور ایسی خوش فہمی میں مبتلا ہونا خود فریبی ہے۔ عائلی قوانین، خاندانی منصوبہ بندی اور بہت سے ایسے معاشرتی اور اقتصادی قوانین کی "مدرسہ" کی طرف سے شدید مذمت ہو چکی ہے۔ اور مستقبل میں کسی بھی یکطرفہ قانون سازی کا یہی حشر ہوگا۔ اس لئے مدارس کی تعداد اور ان کی پیداوار کی مقدار کا سوال نہیں اصل مسئلہ اس روایتی مقام کا ہے جو انہیں معاشرے میں حاصل ہے، اور جس کے زور پر وہ جب چاہتے ہیں حالات کو اپنی موافقت میں بدل لیتے ہیں اور زندگی کے کسی بھی شعبہ میں نافذ ہونے والی اصلاحات کے خلاف مہم چلا لیتے ہیں۔

مسلسل نظریاتی اختلاف و تصادم نے قوم کو اخلاقی طور پر بالکل مفلوج کر دیا ہے۔ منافقت، دھوکہ بازی، اور بددیانتی وغیرہ کا جواز اسی صورت کا نتیجہ ہیں۔ کیونکہ ہر فریق اپنے مدمقابل کے خلاف جنگ میں اقدام روا رکھتا ہے۔ مثلاً ایک ڈاکٹر جو حکومت کی ملازمت کی وجہ سے حکومت کی طے کردہ خاندانی منصوبہ بندی پر دن رات عمل کرتا ہے لیکن دوسری طرف وہ مذہبی وابستگی کی بنا پر اس سکیم سے نفرت کرتا ہے۔ کیونکہ ہر جمعہ کے خطبہ میں وہ خاندانی منصوبہ بندی کو اللہ کے خلاف بغاوت اور اس کے دین سے غداری ہونے کا وعظ سنتا رہتا ہے۔ اسی طرح بنکوں، انشورنس کمپنیوں اور دوسرے تجارتی و اقتصادی اداروں کے ملازمین کے دل و دماغ دو حصوں میں منقسم ہیں، ایک طرف وہ روٹی کے لئے ملازمت اور اس کی ذمے داریاں نباہتے ہیں، دوسری طرف دل ہی دل میں اپنی ملازمت سے نفرت کرتے رہتے ہیں۔ اس صورتِ حال سے معاشرہ میں اضطراب و بے چینی کے سوا اور کس چیز کو فروغ حاصل ہوگا۔

ان وجوہ کی بنا پر بلا خوف لومۃ لائم ہمارا خیال ہے کہ دونوں نظامہائے تعلیم کی موجودگی میں یونیورسٹی کے نصاب تعلیم میں کوئی اصلاح، اساتذہ کے عہدے اور ان کی فلاح کے لئے بہتر وعدے، تعلیمی پالیسیوں کی ترتیب نو، کوئی تعمیری نتیجہ پیدا نہیں کرسکیں گے، جب تک دونوں نظاموں کے مکمل ادغام کی طرف توجہ نہیں دی جاتی، نظریاتی اتحاد اور قومی نقطہ نظر کا پیدا ہونا محال ہے۔ مدارس کو یونیورسٹی سے الگ رکھکر دونوں نظاموں کی "پیداوار" کے ذہنوں میں ایک خلا پیدا کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے سے خائف رہتے ہیں۔ یونیورسٹی کی پیداوار کے ذہن میں یہ بات بٹھادی جاتی ہے کہ ان کی ڈگریاں بالکل بے سود ہیں۔ کیونکہ اصل علم تو دین کا علم ہے۔ جس سے وہ محروم ہیں، اور مدرسہ کی پیداوار کے دل میں یہ بات بٹھائی جاتی ہے کہ قدیم زمانے کے علوم پر دسترس حاصل کر بالکل بے سود ہے کیونکہ اصل علوم تو وہ ہیں۔ جو مغرب نے پیدا کئے" اور جو ہمارے روزمرہ کے حالات و مسائل کو حل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

طلب علوم کے بارے میں جو آزادی اور تاکید دین اسلام میں ہے اس کی مثال کہیں نہیں مل سکتی۔ ہم نے اس مضمون کے آغاز میں ثابت کیا ہے کہ اسلام میں علم فی نفسہٖ مفید ہونے کے ساتھ ساتھ ایمان کا جزو بھی ہے علم کی اسی اہمیت کے پیش نظر مسلمانوں نے ہر قسم کے علوم کی تحصیل کا اہتمام کیا، اور علم جہاں کہیں نظر آیا اسے اپنی گمشدہ متاع سمجھ کر اپنایا، اس کی سرپرستی کی، اس کی ترقی و ترویج میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا "الحکمۃ ضالۃ المومن اینما وجدھا التقطھا" پھر "خذ ما صفا ودع ما کدر" کے اصول کے تحت، مسلمان کسی علم سے ڈرنے یا خوف کھانے کے بجائے نہایت حوصلے اور جرأت سے اسے حاصل کرتا، اس کے حسن و قبح کو ہر پہلو سے پرکھتا۔ اس کے اصول و مبادی کی تہ تک پہنچتا اور پورے تجزیہ و تحلیل کے بعد "قرآنی فرقان" کی روشنی میں اخذ و ترک کے اصول کے تحت اس کے مفید و کارآمد عناصر کو خندہ پیشانی سے اپنا لیتا۔ علم کے ساتھ قرآن کے پیدا کئے ہوئے عشق اور وحیِ الٰہی کی دی ہوئی فکر نے مسلمانوں کو علمی و فکری طور پر اوجِ ثریا تک پہنچا دیا تھا، وہ دنیا کے کسی علم کے سامنے احساس کمتری یا کسرِ نفسی میں مبتلا نہیں ہوتا تھا، عربوں کو اپنی عربیت اور لسانی فصاحت و بلاغت پر جو غرور تھا، قرآن نے اسے پاش پاش کردیا اور اس کی جگہ اسلامی عربی روایت کی بنیاد رکھی۔ جزیرہ عرب کے باہر اسلام کو دو عظیم تہذیبوں سے واسطہ پڑا، ان میں سے روم کو اپنے "قانون" پر ناز تھا اور ایران کو اپنی ثقافت و ادب پر فخر تھا۔ صدرِ اسلام کے فقہاء نے رومی قانون کی روایات میں سے وہ اصول جو اسلامی مزاج کے موافق تھے، انہیں اس حسن و خوبی سے اپنایا کہ وہ

اسلامی فقہ کا حصہ بن گئے۔ ان بنیادی اصولوں کے اخذ کا نتیجہ تھا کہ رومی قانون کی عظمت جاتی رہی اور اس کی جگہ اسلامی قانون کی بالادستی قائم ہو گئی۔ ایران میں جس ادبی روایت کا چرچا تھا ـــــ ادباء نے اس کا مطالعہ کیا اور جب ایرانی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو انہوں نے عربوں کے ساتھ مل کر عربی ادب کو چار چاند لگائے، ایرانی ادب پسپا ہوا اور عربی ادب کا تسلط پوری طرح قائم ہو گیا۔ اس کے علاوہ جن علوم کا براہِ راست مسلمانوں سے تصادم نہیں ہوا تھا خود مسلمانوں نے ان کا کھوج لگایا۔ یونان میں فلسفے کا بڑا چرچا تھا، خود مسلمان خلفاء نے بے شمار یونانی فلسفہ کی کتب کا عربی میں ترجمہ کروایا تاکہ مسلمان حکماء اس دعوت مبارزت میں آگے بڑھیں اور دنیا پر یونانی فلسفے کے تسلط کا زور توڑ دیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلم فلاسفہ نے یونانی فلسفے کے اصول مبادی کا مطالعہ کیا اور اس کے مقابلے میں اسلامی فلسفے کو پیش کر کے یونانی فلسفے پر اپنی بالادستی قائم کر دی۔ ہند و چین میں بھی اگر کوئی چیز قابل اعتنا تھی، تو اس کو مسلمانوں کے صدر مقام میں، جو در اصل علوم و فنون کا مرکز ہوتا تھا، لایا گیا اور مسلمان علماء، حکماء اور فلاسفہ کو ان کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی گئی۔ مسلمانوں نے ان علوم کی گہرائیوں میں جا کر ان کے مفید عناصر کو چن لیا جو عالمگیر سطح پر انسانیت اور اسلام کے لئے کارآمد ہو سکتے تھے۔ ہمارے خیال میں اسلام کو باقی ادیان پر غالب کرنے (لیظھرہ علی الدین کلہ) کا یہ طریقہ سب سے عمدہ اور سب سے بہتر تھا (ادع الی سبیل ربك بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ)۔ ایک طرف مسلمان مجاہدین نے میدانِ کارزار میں اسلام کو غالب کیا تو دوسری طرف علماء، حکماء اور فلاسفہ نے علمی و فکری میدان میں یہ کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ آج بھی ہمیں علمی میدان میں وہی طریقہ اپنانا ہے۔ دنیا کے مروج فکری نظریات سے مسلمانوں کو ڈرانے کے بجائے انہیں اس قابل بنانا ہے کہ وہ سرمایہ داری، اشتراکیت اور کیمونزم وغیرہ نظریات کا کھل کر مطالعہ کریں تاکہ ان میں مضرِ انسانیت عناصر کو پسپا ہونے پر مجبور کر سکیں اور ان کے مفید و کارآمد اجزاء کو اپنے تعلیمی نصاب میں سمو سکیں۔

یہ عام نظریہ کہ جدید تعلیم کے فروغ سے نظامِ مدرسہ خود اپنی موت مر جائے گا حقیقت پر مبنی نہیں۔ ہمارے سامنے عہد حاضر کی دو مثالیں موجود ہیں۔ ایک یورپ و امریکہ کی اور دوسرے کیمونسٹ ممالک کی۔ یورپ نے صدیاں لگانے کے بعد اس مسئلے کا حل یہ سوچا کہ حکومت اور مذہب کو الگ کر دیا۔ کیمونسٹ دنیا نے سرے سے دین کو ختم کر کے اس مسئلہ کا حل تلاش کیا۔ پاکستان، عصر حاضر کی تیز رفتاری میں،

نہ تو یورپ کی طرح صدیوں انتظار کرسکتا ہے نہ ایک دم مدرسے اور مسجد سے نجات حاصل کرسکتا ہے۔ ہمیں اپنے مخصوص حالات کی بنا پر اپنا مسئلہ آزادانہ اجتہاد سے خود ہی حل کرنا ہے اور اس کا بہترین حل یہ ہے کہ دونوں نظاموں میں مکمل ادغام کردیا جائے، دورنگی ختم کرکے یک رنگی پیدا کردی جائے۔

دونوں نظاموں کے ادغام کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دونوں نظاموں کا نچوڑ لے کر اسے اس طرح ملا دیا جائے کہ وہ یک جان ہو جائیں۔ ہمارے خیال میں یہ نظریہ بالکل بے بنیاد ہے کہ ایسا کرنے سے خواہ مخواہ طلبہ کو نصاب کے بوجھ تلے دبایا جائے گا۔ کیونکہ ادغام کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دونوں نظاموں کی ابتدا، ارتقا اور پوری تاریخ ایک دوسرے کے ساتھ رکھدی جائے بلکہ اس سے مراد یہ ہوگی کہ دونوں نظاموں کے علوم و مضامین کی جانچ پڑتال کی جائے، انہیں چھانٹا پھٹکا جائے اور پورے تجزیہ کے بعد ایسے عناصر کو چن چن کر جمع کیا جائے، جو مسائل حاضرہ اور مقتضیات زمانہ سے پوری پوری مطابقت اور ہمارے اقتصادی، معاشی، قانونی اور سیاسی مسائل کے ساتھ وابستگی رکھتے ہوں گے، ماضی اور حال کے علوم کی تاریخ ابتدا، ترقی و ارتقاء چھوڑ کر تصورات، خیالات اور نظریات و فلسفہ اپنایا جائے۔

موجودہ اختلاف و تصادم کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ زندگی کے بعض شعبوں میں تو یہ بڑا متحرک اور جاندار ہے لیکن بعض دوسرے شعبوں میں نہایت جامد اور بے جان، خونریز تصادم عموماً معاشرتی علوم میں ہو رہا ہے اور طبعی علوم میں اس کا وجود بہت کم ہے۔ سائنسی علوم نصاب مدرسہ میں داخل نہیں، غالباً اسی لئے مدرسہ کی پیداوار نہ تو ان علوم کے اس ماضی سے پوری طرح آگاہ ہے جس میں مسلمان سائینسدانوں اور فلاسفہ نے کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے اور نہ ہی اس کے حال سے بخوبی واقف ہے، جس میں مغرب نے حیرت ناک ترقی کی ہے۔ مغرب نے تو صدرِ اسلام اور ازمنۂ وسطیٰ کے مسلم سائینسدانوں کے افکار و نظریات پہلے ہی اپنا لئے ہیں اور مغربی سائینسدانوں نے ان افکار و نظریات کو مزید ترقی دیکر اپنے تصورات و افکار میں جگہ دیدی ہے۔ لہٰذا اب زمانۂ قدیم کے سائینسدانوں کی تاریخ پیدائش و وفات اور ان کی فروعی تفصیلات بتانے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی۔ مدرسہ بھی اس حقیقت سے واقف ہو چکا ہے چنانچہ ہمارے علماء سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں کہ یونانی فلسفہ و حکمت جو کبھی ضرورت کے تحت مسلمانوں نے اپنائے تھے اگر ان کی جگہ آج وہ مغربی علوم و افکار و تجربات لے لیں جو اسلام کیلئے قوت فراہم کریں، تو یہ تبدیلی نہایت خوش آئند ہوگی۔

عملی ادغام کے دائرہ کو محدود کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت صرف تین ایسے بنیادی موضوعات ہیں، جن کا ادغام فوری طور پر نہایت ضروری ہے۔ ہم بقیہ علوم و موضوعات کی اہمیت کے منکر نہیں، تاہم اگر ان تین علوم و موضوعات کے بارے میں جو کچھ مواد نظام مدرسہ میں موجود ہے۔ اسے انتہائی مہارت اور کامیابی کے ساتھ یونیورسٹی نصاب میں سمو لیا جائے تو نظام مدرسہ میں دینیات ہی باقی رہ جائے گی۔ یہ تین مضامین، قانون، معاشیات اور سیاسات ہیں۔ قیام پاکستان کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ "مسٹر" اور "مولوی" کی لڑائی عام طور پر انہی تین میدانوں میں ہوتی رہی ہے۔ عائلی قوانین، خاندانی منصوبہ بندی، بینکنگ، انشورنس، حاکمیت اعلیٰ کا تصور وغیرہ مسائل انہیں مضامین کے پیدا کردہ ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ انتہائی حکمت، حزم و مہارت اور محنت سے ان مضامین سے متعلق تفاصیل اسلامی علوم سے اس خوبی سے جمع کی جائیں کہ کوئی قابل اعتنا چیز باقی نہ رہ جائے، اور یہ انتخاب یونیورسٹی نصاب میں حسن و خوبی کے ساتھ سمو دیا جائے۔

طریق کار یہ ہو کہ قانون، معاشیات اور سیاسیات کو باقی تمام مضامین پر ترجیح دی جائے اور کالج کے بقیہ مضامین میں ان مضامین کو خصوصی اہمیت حاصل ہو۔ ان مضامین کے موجودہ نصاب کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ ان میں اسلامی نقطۂ نظر کے لئے پوری گنجائش موجود ہو، ان مضامین کی تدریس کے لئے خاص طور پر اہتمام کیا جائے اور ملک کے ذہین اور ہونہار طلبہ کے لئے وظائف وغیرہ کی کافی کشش مہیا کی جائے۔ وہ طلبہ جو قانون، معاشیات اور سیاسیات میں تخصص حاصل کرنا چاہیں، ان کے لئے لازمی ہو کہ وہ کالج کے پہلے سال ہی ان مضامین کو اپنا لیں اور بی۔ اے کے بعد ایم۔ اے اور پی۔ ایچ ڈی کر کے ان میں مہارت تامہ حاصل کریں۔ اس طرح ہمارے مستقبل کے قانون دان، ماہرین معاشیات و سیاسیات اپنی نظیر آپ ہوں گے، وہ سب سے زیادہ قابل، اہل اور ثقہ ماہرین ہوں گے اور سب سے زیادہ وہ اہلیت رکھتے ہوں گے کہ اسلام کو دورِ جدید میں ایک متحرک اور قابلِ عمل دین کی حیثیت سے پیش کر سکیں۔ مستقبل کے یہ ماہرین اس مقام پر فائز ہوں گے کہ "مدرسہ اور یونیورسٹی" دونوں کے فاضلین ان کی بات پر توجہ دے سکیں۔ اس طرح پاکستان کو وہ مقام بلند حاصل ہوگا کہ نہ صرف مسلم دنیا بلکہ غیر مسلم دنیا بھی، پاکستان سے رہنمائی طلب کرنے کی ضرورت محسوس کرے گی۔